R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy—15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

بھارتی بھاشا سمیتی کا دوسرا جلسہ

۲۸ اور ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو بھارتی بھاشا سمیتی کا دوسرا جلسہ ہوا۔ یہ سمیتی مرکزی وزارت تعلیم نے جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لیے بنائی ہے۔ پہلے اجلاس کا افتتاح ڈاکٹر سین وزیر تعلیم نے کیا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ اب ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے باقاعدہ پروگرام کے تحت کوشش کرنا چاہیے۔ حکومت ہند اس مقصد کے لیے اٹھارہ کروڑ کی رقم مخصوص کر رہی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ریاستوں، یونی ورسٹیوں اور اہل دانش کی مدد سے یہ کام اس طرح ہوگا کہ جدید زبانوں کے علمی سرمائے میں بھی اضافہ ہو اور تعلیم کا معیار بھی گرنے نہ پائے۔ اس کے بعد چند اہم مسائل پر بحث ہوئی۔ سب سے زیادہ وقت علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کے اصولوں پر صرف ہوا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ تمام اصطلاحات سنسکرت سے لی جائیں۔ کچھ اس پر زور دیتے تھے کہ تمام بین قومی اصطلاحات جیسی کی تیسی لے لی جائیں۔ کچھ لوگ ہر زبان کو اس معاملے میں آزاد چھوڑنے کے حامی تھے کہ ان کے جاننے والے جس اصول کو بہتر سمجھیں، اسے برتیں۔ بالآخر یہ اچھا فیصلہ ہوا کہ بین قومی اصطلاحات کو ہر زبان کے مزاج کے مطابق اپنایا جائے۔ وزارت کی ایک ٹیم نے اس سلسلے میں اُن اصولوں پر زور دیا جن کے متعلق مرکزی ہندی ڈائرکٹریٹ نے اپنی اصطلاحات تیار کی ہیں۔ ہمارے نزدیک یکسانیت اور سہولت دونوں کی خاطر ان قومی اصطلاحات کو جو اس وقت مغرب میں رائج ہیں، ہر زبان کے مزاج کے مطابق قبول کر لینا چاہیے۔ ہاں نیم علمی اصطلاحات کے سلسلے میں چلن اور قبول عام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اردو اور پنجابی کے نمائندوں نے اس بات پر زور دیا کہ جدید ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا سارا کام بجائے ریاستوں کے یونی ورسٹیوں کے سپرد کرنا چاہیے کیونکہ ریاستیں اوّل تو سیاسی مقاصد کے تحت کام کریں گی اور دوسرے چونکہ انھیں بہرحال یونی ورسٹیوں کی مدد لینا ہے اس لیے یونی ورسٹیوں کو ان کاموں کا ذمہ دار بنانا بہتر ہوگا۔ بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ریاستی حکومتوں کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ ہر ریاست کی تمام یونی ورسٹیوں کے نمائندوں کو جمع کر کے ان کی مدد سے ریاستیں یہ کام کریں۔ اردو اور سندھی کے سلسلے میں مرکزی وزارت تعلیم یونی ورسٹیوں سے یہ کام کرا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ تراجم کے مقابلے میں زیادہ زور طبع زاد تصانیف پر رہے اور تراجم زیادہ تر بنیادی مغربی تصانیف کے ہوں۔ دلی میں ایک مرکزی ادارہ قائم کرنے کی تجویز بھی منظور ہوئی جو تمام زبانوں میں کام کی نگرانی کرے گا اور اردو، سندھی اور سنسکرت میں خاص طور سے کام کرائے گا۔ یہ بھی طے ہوا کہ سہ زبانی لغات پر خاص زور دیا جائے۔ اور ہر زبان کی ایک لغت انگریزی اور ہندی کے مترادفات کے ساتھ شائع کی جائے جس میں بیس ہزار کے لگ بھگ الفاظ ہوں۔ آخر میں یہ بھی طے ہوا کہ مرکزی حکومت علمی کتابوں کی ہزار ہزار کاپیاں خریدے تاکہ مصنفوں کی ہمت افزائی ہو اور علمی کتابیں لکھنے کا سلسلہ عام ہو۔ بھارتی بھاشا سمیتی نے بعض اچھے فیصلے کیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان پر جلد سے جلد عمل درآمد ہو۔ اردو اور سندھی کے سلسلے میں خاص طور سے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں کام کے لیے ادارے جلد قائم ہوں۔ یہ اُن یونی ورسٹیوں میں ہونے چاہئیں جن کا اردو سے خاص تعلق ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، عثمانیہ یونی ورسٹی اور جموں و کشمیر یونی ورسٹی اس کام کو مل کر انجام دے سکتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند اور اردو کے دوسرے اداروں کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہیے۔ سندھی کے لیے بمبئی یونی ورسٹی سے مدد لی جا سکتی ہے۔

زبان کے مسئلے میں سب کی سہولت دیکھنی چاہیے۔ سب کی ضروریات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ پھر ہمارا رخ آگے کی طرف ہونا چاہیے پیچھے کی طرف نہیں۔ زبان کے سلسلے میں پالیسی ماہر لسانیات، اساتذہ، اہل دانش اور ادیبوں کے مشورے سے بننی چاہیے اور اس کے لیے مناسب سرمایہ فراہم کرنا چاہیے۔ ہمیں تمام زبانوں کو ترقی کا موقع دینا ہے تاکہ ان کی ترقی کے ذریعے ایک طرف نیا ذہن بنے اور ملک کی یک جہتی اور سالمیت میں مدد ملے اور دوسری طرف یہ زبانیں دولت مند ہوں گی اور وہ تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے ایک صالح شخصیت اور ایک نیا ذہن پیدا کر سکیں۔

علی عباس حسینی کی ادبی خدمات کا اعتراف

علی گڑھ۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور افسانہ نگار کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیش سرکار نے پانچ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے

ادارہ ہماری زبان علی عباس حسینی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اردو کے ممتاز جدید شاعر وحید اختر کے مجموعہ کلام پر غالب انعام

علی گڑھ۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز جدید شاعر و نقاد ڈاکٹر وحید اختر کو ان کے مجموعہ کلام "پتھروں کا مغنی" پر یوپی سرکار کمیٹی اتر پردیش نے ۵۰۰ روپیہ کا سب سے بڑا انعام غالب انعام دینے کا اعلان کیا ہے وحید اختر کا یہ مجموعہ کلام ۱۹۶۶ء میں اردو گھر علی گڑھ نے شائع کیا تھا اور اس کی اشاعت کا ادبی حلقوں میں بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا تھا وحید اختر کے مجموعہ کلام کے علاوہ اردو کی مندرجہ ذیل کتابوں پر بھی انعام دیئے گئے۔

مرزا رفیع سودا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اکبر الٰہ آبادی انعام ۱۲۰۰ روپیہ

نذر دلاوری۔ محمد ابرار حسین رام پرشاد بسمل انعام ۸۰۰ روپیہ

حج کا سفر۔ محمد رضا انصاری ۵۰۰ روپیہ

انیسویں صدی میں ہندوستانی اخبار اور دستاویزیں محمد عتیق صدیقی ۵۰۰ روپیہ

ٹکلنے ایک رباب۔ حسرت الاکرام ۵۰۰ روپیہ

سفر تمدن۔ نذر امام ۵۰۰ روپیہ

داد کی بے داد۔ عبدالمجیب سہالوی ۵۰۰ روپیہ

ادارہ ہماری زبان ان تمام مصنفین کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کا ملازمت سے رشتہ منقطع

لکھنؤ ۲۰ مارچ۔ اردو کے ممتاز شاعر اور زبان داں حضرت جوش ملیح آبادی جو پاکستان منتقل ہو گئے ہیں، باوثوق ذرائع کے مطابق سرکاری ادارہ ترقی بورڈ سے برطرف ہو گئے ہیں۔ جوش صاحب جو حکومت پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والی جامع اردو لغت کی ترتیب دینے والے عملہ کے گراں قدر شاعر سربراہ تھے، حال ہی میں نجی ضرورت سے اپنے آبائی وطن ملیح آباد ضلع لکھنؤ آئے تھے، اور دہلی، بمبئی، آگرہ وغیرہ بھی ادبی محفلوں میں شرکت اور ادبی دوستوں سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ جوش صاحب تین مہینے سے زیادہ یہاں قیام کر کے واپس پاکستان چلے گئے تھے۔ باوثوق ذرائع کے مطابق جوش صاحب کی ملازمت کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ (قومی آواز)

علی شیر نوائی کی ۵۲۵ ویں سالگرہ

تاشقند ۲۶ مارچ۔ قومی جوبلی کمیٹی نے عظیم ازبیک شاعر علی شیر نوائی کی ۵۲۵ ویں سالگرہ شہر میں منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جولائی ۱۹۶۶ء میں منائی جانے والی تھی لیکن تاشقند میں زلزلوں کے باعث، اس کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ غیر ملکوں کے علماء اور ادیب بھی اس تقریب میں حصہ لیں گے۔

(تاس)

وزیر آغا آفریدی

تاج محل

خیالِ حسن و محبت، لحاظِ عہد وفا!
دل و نظر کو جگاتے ہے کہ جیسے سحر کیا!
خبر نہیں کہ کہاں ٹھہرے زندگی کی ادا!
ابھی تو ایک ہی وحدت ہے عشق کی بیکل

یہ تاج ہے کہ محبت کی یادگار کوئی
کہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کا ہے قرار کوئی
کرے تو میری طرح تجھ سے کاش پیار کوئی
جلائے جاتے ہیں یوں بھی تو زندگی کے کنول

زمیں پہ آیا ہوا نور کا یہ اک ٹکڑا!
یہ شکل تاج ہے گویا اک آرزو کی فضا
یہ نقش سبز و سیہ، سرخ اور مرمریں اعضا
چمن کے بیٹھے کوئی جیسے دودھیا ململ

پکارتا ہے یہ شہکار مجھ کو داد تو دو!
مرے جہاں کے کرشمے کی تاب ہے کس کو
مری نظر کی یہ تقدیس عرش و فرش نہ ہو
ہیں ایک حسنِ نظر ہوں یہ ایک حسنِ ازل

کوئی ہو دور کسی سے کہ کوئی پہلو نشیں
مگر خیال و گماں کی حدود بھی تو نہیں!
فنا ہے آخر ہر کار آسمان و زمیں
تو پھر ہمیشہ رہے گا یہ کیسے تاج محل!!

اردو گھر نئی دلی

ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو دوستوں سے یہ خوش خبری معلوم ہوگی کہ پروگرام کے مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۶۷ء کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ہاتھوں اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھا گیا

یہ رکھا گیا۔ یہ تقریب بخیر و خوبی انجام پائی ۱۵ اپریل کے ہماری زبان میں تمام تفصیلات شائع کی جائیں گی۔

ادارہ

پروفیسر مسعود حسین خاں

ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور اردو

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ سیاسی قائدین کے ہاتھوں میں ایک تماشہ سا بن گیا ہے۔ آزادی کے بیس سال میں اس کے کیا کیا نام ہوئے نہ بنے اور یہ کیسی کیسی نشیب و فراز سے دوچار ہوا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ آج انگریزی کے پاسبان خود صنم خانے سے مل گئے ہیں۔ انگریزی کی خاطر ہندوستانیوں نے جانیں دیں، اس کی خاطر اسٹیشن جلائے گئے، بسیں لوٹی گئیں غرض کہ ہر وہ حرکت بے جا کی گئی جو جمہوریت کے چہرے پر سیاہ داغ ہے۔

اس عہد انقلاب کی ابتدا ہوئی اس تصور سے کہ ہندی اور ہندوستانی قومیت لازم و ملزوم ہیں۔ اردو ایک پاکستانی اور انگریزی ایک بیرونی زبان ہے۔ تلنگی، تامل اور بنگالی کو بھارتی بننے کے لیے ان کا "ہندیانا" ضروری ہے۔ یہ تصورات غلط مفروضات پر قائم تھے اس لیے ان مفروضات کو ختم ہونے کے لئے ردعمل کی ضرورت تھی ردعمل آیا لیکن دیر میں آیا اور جزوی آیا۔ سہ لسانی اور دو لسانی فارمولوں کی تکرار کے بعد بہر حال سرکاری طور پہلے ہی پایا کہ سہ لسانی فارمولے ہی میں نجات ہے۔ یہ لسانی فارمولا لسانی اقلیتوں کے لیے چہار لسانی بن جاتا ہے۔ بیس سال کے غور و فکر میں بہر حال دو صداقتوں کا علم ہوا۔ پہلی یہ کہ مادری زبان تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے اور دوسری یہ کہ ملک کی وحدت اور سالمیت کے پیش نظر رابطہ کی زبان کا استحکام ضروری ہے۔ ان دونوں صداقتوں کے انکشاف کے بعد بھی الجھاؤ باقی رہ گئے ہیں۔ پہلی یعنی مادری زبان کی صداقت کے ساتھ یہ پیچ رہی کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہوگا جن کی مادری زبان ریاست کی علاقائی زبان نہیں۔ دوسری کے ساتھ یہ سوال قائم ہوا کہ رابطہ کی زبان ہندی ہو یا انگریزی یا دونوں۔

پہلے رابطہ کی زبان کے مسئلہ کو لیجیے آزادی کی پہلی لہر میں ہندی والے دستور ساز اسمبلی سے یہ منظور کرا لے گئے کہ ۱۹۶۵ء تک انگریزی کا چلن رہنے کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم خط میں بنائی جائے گی۔ ہمارے دستور کی اکثر دفعات میں ابہام بالقصد رکھا گیا ہے گورنر اور ریاستی کابینہ کے باہمی ربط کے غیر واضح ہونے کا خمیازہ تو ہم آج کل بھگت ہی رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ہمارے دستور سازوں نے سرکاری زبان کے متعلق دفعات میں جو ابہام رکھا ہے اس کی مثال متاخرین شعرائے فارسی کے بیان ہی میں مشکل سے ملے گی۔ زبان کا تمام مسئلہ اسی کا بھگتان ہی ہے چنانچہ جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے اور ۱۹۶۵ء قریب آتا گیا خود پنڈت نہرو کی زندگی میں سطح مرتفع دکن سے زبان کے بارے میں گڑگڑاہٹ اٹھنے لگی بالآخر اس نے ۱۹۶۵ء کے تامل ناڈ کے زلزلے کی شکل اختیار کرلی۔ چونکہ ہماری جمہوریت میں روشنی لینے کے لیے ہمیشہ ایک صدمہ شدید کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اچانک محسوس کیا گیا کہ ۱۹۶۵ء بہت قریب آگیا ہے ہندی ہنوز کمسن کنیا ہے اور انگریزی کے بغیر کام چلانا ممکن نہیں۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے ایک تاریخی اعلان سے ہندوستان میں انگریزی کے چلن کی مدت اور بڑھ گئی جس کی مصدقہ شکل اب لینگویج ایکٹ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ بل ایکٹ بنے عمل اور ردعمل کی تکرار شروع ہوگئی اور بل کی بعض دفعات میں ایسی ترمیم کرادی گئی کہ ہندی والوں کا کام صرف ہندی پڑھنے سے چل جائے جب کہ دیگر زبانیں بولنے والے لازمی طور پر انگریزی یا ہندی سیکھیں۔ اس کے خلاف بنگال میں طوفان اور سطح مرتفع دکن میں پھر لرزش زیر زمیں شروع ہوگئی ہے۔ چنانچہ سیاسی ذہن اب اس انداز میں سوچ رہا ہے کہ سول سروس کے امتحانات میں انگریزی اور ہندی کے پرچے تو رکھے جائیں لیکن ان پرچوں کے نمبر نہ جوڑے جائیں تاکہ نتائج امتحان پر اثر نہ پڑے۔

دوسرا مسئلہ مادری یا ریاستی (علاقائی) زبان کا ہے۔ اردو کا مسئلہ اسی سے بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی ایک کل ہند حیثیت ہے۔ مختلف ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ (یو۔پی) سے لے کر ۳۲ لاکھ (میسور) تک جاتی ہے۔ دیگر ریاستوں میں بھی دو لاکھ تا دس لاکھ کی تعداد میں اردو بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں اس کو مادری زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے لیکن یہ وہاں کی تہذیبی اور سرکاری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اردو کا بنیادی مسئلہ اب اس قدر کل ہند حیثیت کا نہیں رہا جتنا کہ ریاستی یا علاقائی حیثیت کا بن گیا ہے مثلاً یو۔پی اور بہار میں اس کا مقابلہ ہندی سے ہے۔ ہندی۔ اردو ایک ہی لسانی حقیقت کی دو شکلیں ہیں اس لیے یہ ایک دوسرے میں جذب بھی ہو سکتی ہیں اور انجذاب کے اس عمل میں ایک دوسرے کو متاثر بھی کر سکتی ہیں۔ یہاں اردو رسم خط کا ایک اہم رول ہے۔ وہ حضرات جو اردو کے لیے دیوناگری رسم خط تجویز کرتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندی کے علاقے میں اردو کا وجود اسی سے عبارت ہے۔ وہ نہ اردو کے اسالیب میں وہ وسعت ہے کہ ایک طرف اس کے ڈانڈے ہندی سے ملتے ہیں اور دوسری طرف فارسی سے۔ اردو رسم خط کے پیچھے ایک تہذیب اور تاریخ ہے۔ اسے مصلحتوں اور مجبوریوں کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا تاآنکہ وہ مجبوراً ایک کل ہند سطح پر نہ ہو جس میں ہندوستان کی ہر زبان کو کچھ کھو کر کچھ پانا پڑے۔ ہر زبان کا ایک اجتماعی وجود اور اس کی ایک انا ہوتی ہے۔ جو تاریخ کے عمل میں رفتہ رفتہ تکمیل ہوتی ہے۔ اتاترک نے ترکی میں اس پر جو ضرب کاری لگائی تھی اس کا ردعمل اب ترکی میں پایا جاتا ہے جس کے زیر اثر ترک اور ترکی دونوں آج اپنے وجود پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں دیوناگری رسم خط تجویز کرنے والوں سے میں یہ کہوں گا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ جرأت استدلال پیش کیوں نہیں کرتے کہ اردو والوں کو صاف صاف اب ہندی اختیار کر لینی چاہیے اس لیے کہ اردو کا اب ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں۔ میرے خیال میں اس تجویز میں پھر بھی ایک استدلال لسانی ملتا ہے کہ اقلیتوں نے بارہا اپنی زبانیں بدلی ہیں۔ جزوی اور تمام ضروریات کے مقابلے میں بے محابا ہو تو کم از کم ایک نسل کو لسانی دورنگی سے بچالے گی۔

اردو کا موقف جہاں تک جنوبی ہند کی ریاستوں کا تعلق ہے قدرے مختلف ہے۔ دکن کی جن ریاستوں میں اردو بولنے والے خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور میسور ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کی علاقائی زبان کا تعلق زبانوں کے ہند آریائی گروہ سے ہے اس لیے اردو اور مرہٹی کے مابین کافی مشترک لسانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ دراصل دکن میں قدیم اردو کا تشکیلی گہوارہ مرہٹی ہی کا علاقہ رہا ہے۔ آندھرا پردیش اور میسور میں اردو کا سابقہ دراوڑی

خاندان کی دو زبانیں تلگو اور کنڑی سے ہے۔ اردو اور ان زبانوں کے مابین صرف سنسکرت سے ماخوذ الفاظ کا اشتراک ہے ورنہ قواعد کے اعتبار سے اردو ان زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ دکن کی زبانوں سے اردو کے اختلاط کی ایک حد حاصل ہے اور ان میں انجذاب ناممکن ہے۔ سابق سلطنت آصفیہ کی شہری اور قصباتی آبادی کو چھوڑ کر دکن کا تمام اردو داں طبقہ دو لسانی ہے یعنی مرہٹی کے علاقے میں وہ مرہٹی بولتا ہے اور تلگو کے علاقے میں تلگو۔ قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانے سے یہ دو رنگی قائم ہے چونکہ اردو حکمرانوں کی زبان تھی اس لیے اس وقت اس دو رنگی کا جھکاؤ اردو کی جانب رہتا تھا۔ اب صورت حال مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ آج جبکہ تلگو اور کنڑی بولنے والوں کی نئی نسل اردو سے قطعاً احتراز کر رہی ہے اردو بولنے والے ان زبانوں کے سیکھنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد جیسے اردو شہروں میں اردو بولنے والے بچے اب تلگو پڑھ رہے ہیں۔ یہ بچے پڑھ کر جب بڑے ہوں گے تو انہیں کام چلاؤ تلگو آتی ہوگی۔ اور اسی نسبت سے اردو سے ان کا سابقہ کم ہو جائے گا۔

شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں یہ دو لسانی دو رنگی ابھی عرصے تک قائم رہے گی جب کہ شمالی ہند میں گھریلو زبان کے محاورے میں کوئی بڑی تبدیلی ہوئے بغیر اردو والوں کی نئی نسل ہندی میں رنگی جا چکی ہے۔ دکن میں تلگو یا دوسری زبان کی قدرت کے ساتھ استعمال کرنے میں ابھی عرصہ لگے گا۔ چنانچہ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر اردو والے چاہیں تو اپنی تنظیم کر سکتے ہیں۔ کسی بھی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کے یہاں لسانی انا کا شعور ہو۔ اس کی قدر کا احساس ہو اور وہ اپنے لیے اردو کو ناگزیر سمجھتے ہوں۔ اس کے بغیر کسی بھی اقلیت کی زبان کا زندہ رہنا دشوار ہے۔ تاریخ لسانیات شاہد ہے کہ تیسری نسل تک ان اقلیتوں کی زبانیں بدل جاتی ہیں تاآنکہ وہ ایک اسرائیل نما گروہ پر فائز نہیں۔ اجتماعی انا کی اس شرط کو پورا کرنے کے بعد تنظیم کا ہونا ضروری ہے۔ تنظیم ہمارا اگر در تر نہ ہو رہا ہے۔ عمل کی نا اہلی ہمارا مرض دیرینہ ہے۔ خود ہمارے شہر حیدرآباد میں بے شمار نیم جاں انجمنوں کے ادارے ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے ہم ایک بھی ادارہ جیسا کہ چاہئے نہیں چلا سکتے۔ اقلیتوں کی زبان کے تحفظ و ارتقا کے کئی محاذ ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق محاذ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ سیاسی پلیٹ فارم کی جد و جہد سے قطع نظر اردو کے تعلیمی نظام کی تنظیم وقت کا اہم مسئلہ ہے۔ بالخصوص ان بڑی تبدیلیوں کے پیش نظر جو آندھرا پردیش کے تعلیمی نظام میں ۱۹۹۶-۹۷ء سے آنے والی ہیں۔ جب تلگو کو یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کا آغاز کر دیا جائے گا۔ اس وقت اردو کی صورت حال کیا ہوگی اردو کالجوں کا قیام کہاں کہاں ہو سکے گا۔ اردو کی متوازی کلاسیں کہاں کہاں قائم کی جا سکیں گی۔ جن قصبوں اور قریوں میں اردو بولنے والے بچے بہ مجبوری تلگو میڈیم سے پڑھیں گے کیا وہاں اردو کو بحیثیت ایک لازمی مضمون کے پڑھایا جا سکے گا۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں اردو دوسری زبان والے اساتذہ کا کیا حشر ہوگا اب تک جو انگریزی کے سہارے سے گزر بسر ہو رہی ہے اس کے لیے کیا سہارا ہوگا؟

یہ ہے وہ ہمہ جہت لسانی مسئلہ جو آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے سر پر ناگہاں کھڑا ہوا ہے جس کا سیاسی، علمی اور تعلیمی سطح پر حل ڈھونڈھنا ناگزیر ہے۔

صابر الہاشمی مدینہ

حجاز میں اردو

اردو کا مستقبل ایک سوال بن چکا ہے۔ جواب دینے والوں نے طرح طرح کے جوابات دیئے ہیں لیکن اس سے ہر شخص کو اتفاق ہے کہ اس درخت کی جڑیں جس دور تک پھیل چکی ہیں اس سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسے اپنی جگہ سے ہلانا بھی مشکل ہے۔ اردو ان چند خوش قسمت زبانوں میں سے ایک ہے جو دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اندازہ ہے کہ اس وقت حجاز میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کا اوسط دس فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس عرب الدیار زبان کے عالموں کو اس زبان کی زندگی اور بقا سے وہ آگے بڑی دلچسپی بھی ہے۔ آپ جب مدینہ منورہ آئیں تو یہاں کی ایک ہر دلعزیز شخصیت سے [illegible] ضرور ملیے۔ امید ہے کہ آپ ان سے مل کر ضرور خوش ہوں گے۔ ان کے چہرے کے واضح نقوش بتائیں گے کہ ان کے والد ترکستانی ہیں اور ان سے جب اردو میں آپ کی گفتگو ہوگی تو یہ اندازہ کچھ مشکل نہ ہوگا کہ ان کی والدہ ہندوستانی ہیں خاص لکھنؤ کی ہیں اور اس طرح ان کی یہ مادری زبان ہے۔ اگر آپ کی ملاقات ان سے گھر سے باہر ہوئی تو پہلی نظر میں آپ ان کے لباس اور عربی زبان میں بے تکلف بات چیت سے اس دھوکے میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ یہ خالص عرب ہیں۔ یہ ہیں سید احمد مدنی جن کی ذاتی کوششوں کے نتیجہ میں آج مدینہ منورہ میں سید الابرار کے نام سے اردو کی راہ میں گرم سفر ایک ادارہ موجود ہے۔ بزم اردو کی یوں تو ہر ماہ ہر جمعہ کو نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت میں آپ کے سامنے شام غالب کے نام سے مرحوم کی صد سالہ برسی کے موقع پر منعقد ہونے والی اس یادگار نشست کی کچھ جھلکیاں پیش کرنا چاہتا ہوں جو ایک طرف تو مرحوم غالب کے لیے ایک امتیازی اعزاز کا باعث ہے دوسری طرف مدینہ منورہ کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی نشست ہے۔ نشست کا افتتاح ۲۲ فروری کو رات کے ساڑھے تین بجے محلہ حارۃ الاغوات میں صدر بزم حافظ سید احمد ولی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ صدارت مولانا انور حسین [illegible] نے کی جو ہماری خوش قسمتی سے اس وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے اور پیرانہ سالی اور انتہائی نقاہت کے باوجود ہماری درخواست پر شریک بزم ہوئے۔ مولانا کا خطبۂ افتتاحیہ جسے مرزا حسین صدیقی نے پڑھا کامیاب خطبہ تھا۔ نشست کا پہلا دور مقالات سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے سید ابو الفاروق ندوی نے اپنا مقالہ غالب بزم اردو میں پڑھا۔ دوسرا مقالہ مولانا عبد الملک صاحب کا تھا۔ مولانا کی ذات گرامی سے نہ تو اہل علم اور نہ اہل نظر ناواقف ہیں۔ مولانا کا قلم کسی تعارف کا محتاج ہے۔ اس مقالہ کا اصل موضوع تو مولانا محمد علی جوہر کی وہ عقیدت اور عشق ہے جو ان کو غالب سے تھی چنانچہ موصوف نے جو شواہد پیش کئے ہیں اس سے حقیقتاً یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کے عشق کی صف میں مولانا مرحوم کا نام سب سے پہلے آتا ہے پھر یہ ذکر چھڑ ہی گیا جو دو تین گھڑی رہا کر غالب کی شخصیت کسی ایک جہت عقیدت تک محدود نہیں رہی بلکہ اس شمع سخن کے پروانوں میں ہر وہ نام آتا ہے جو چمکے خود آسمان اردو کا ایک درخشندہ آفتاب بنا۔ ہماری پچاس سالہ تاریخ میں تحریک خلافت جیسی عظیم ترین تحریک ہے ہو نہ کے اس مقالہ کو حسب توقع سامعین نے پوری داد بھی دی۔ اس دور کے آخر میں مولانا راقم صابری نے اپنے مقالہ کا مقدمہ سنایا جس کا عنوان "حجاز میں شعراء اردو" تھا۔ اس پر اس بزم کا پہلا دور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس میں ذیل کے شعراء نے حصہ لیا: مرزا حسین صدیقی، اشتیاق شیر کوٹی، صابر ہاشمی، سید احمد مدنی، محبوب آزرمانی محبوب، عبد الجلیل صاحب موسوعہ، اسکندر مرزا صاحب مجنون، امداد حسین صاحب کوثر اور صوفی غلام محمد صاحب صوفی تھے۔ ساڑھے چھ بجے یہ یادگار بزم جس کی خوبی خاتم حسین نعمانی کے شکریہ پر ختم ہوئی۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

گزشتہ سال اپریل کے پہلے ہفتے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے جدیدیت اور ادب کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں مختلف الخیال حضرات نے مضامین پڑھے تھے اور بحث و مباحثے میں حصہ لیا تھا سیمینار کی آخری نشست میں براج کومل نے "جدید نظم۔ چند پہلو" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں اردو نظم کے بعض جدید ترمیلانات کی نشاندہی کی گئی تھی اور اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے تھے۔ مقالہ نگار نے ضمنی طور پر ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں جدید تر شاعروں کے ذہنی رویے اور فنی طریق کار کا فرق واضح کرنے کے لیے یہ بھی لکھا تھا کہ ترقی پسند شاعری کو میں خط مستقیم کی شاعری سمجھتا ہوں اور جدید تر شاعری کو خط منحنی کی شاعری۔ خط مستقیم کی شاعری سے ان کی مراد اس شاعری سے تھی جو طے شدہ پروگرام کے ماتحت کسی نادیدہ مینی فسٹو یا کسی سیاسی جماعت کی پالیسی کے مطابق کی جائے اور اس قسم کی نظم کا خاتمہ بھی طے شدہ ہو اس کے برخلاف جدید شاعری وہ ہے جو تجربات و محسوسات کے متعلق ایک فرد کے آزادانہ ردعمل اور انکشاف حقیقت میں انفرادی طرز فکر و طرز احساس پر مبنی ہو۔ کومل کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"اردو زبان کی بیشتر ترقی پسند شاعری خط مستقیم کی شاعری ہے اور طے شدہ نقطۂ آغاز سے طے شدہ نقطۂ انجام اور طے شدہ نتائج کی شاعری ہے۔ اور ان طے شدہ نتائج کو بار بار پیش کرنا شاعروں کا شعری پروگرام ہے۔ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی خط مستقیم کے شاعر ہیں فیض کی شاعری کی نسبتاً زیادہ اثر انگیزی اس مفاہمت کا نتیجہ ہے جو فیض نے رومانی آویزش اور خط مستقیم کے درمیان قائم کرلی ہے۔"

سردار جعفری نے کومل کا یہ مضمون اپنے رسالہ "گفتگو" میں شایع کرنے کے لیے ان سے لے لیا تھا۔ اس مضمون کی یہی چند سطریں ان کے دل میں اس طرح جاگزیں ہو گئیں کہ انھوں نے اپنی طرف سے مضمون کا عنوان بدل کر "خط مستقیم اور خط منحنی کی شاعری" رکھ دیا اور شایع کرنے کے بعد اس کے جواب میں ایک مضمون لکھنے کی بھی ضرورت محسوس کی۔ جوابی مضمون میں ایک جگہ انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ فیض کو خط مستقیم کے اس قبیلے سے ذرا سا مختلف بتایا گیا ہے جس کے اہم نمائندہ سردار جعفری اور دیگر شعراء ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر قمر رئیس کے حوالے سے حاشیے میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جب یہ مضمون سیمینار میں پڑھا گیا تھا تو کومل نے فیض کو بھی اسی زمرے میں رکھا تھا یا محض فیض کو ہی اپنے حملے کا نشانہ بنایا تھا۔"

قطع نظر اس کے کہ واقعہ کیا ہے سردار جعفری نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ادب کا کوئی طالب علم خواہ وہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو فیض اور سردار جعفری دونوں کو ایک قبیلے کا شاعر نہیں سمجھ سکتا اس لیے کہ باوجود ترقی پسند نقطۂ نظر رکھنے کے دونوں کا شعری مزاج اور فنی طریق کار ایک دوسرے سے بالکل الگ رہا ہے۔ سردار جعفری اگر براہ راست انداز بیان کے قائل رہے ہیں تو فیض بالواسطہ اسلوب کے دلدادہ ہیں۔ سردار جعفری کے یہاں خطابت، گھن گرج، نعرہ زنی، طوالت اور صراحت ہے تو فیض کے یہاں دھیما غنائی لہجہ، رمزیت و ایمائیت، نرمی و شیرینی اور ارتکاز و اختصار ہے۔ سردار جعفری کے قبیلے میں اگر اور ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ فیض یا اختر الایمان کی طرح کے شاعروں کا نہیں بلکہ کیفی اعظمی، اجمل نثار اختر، نیاز حیدر، وامق جونپوری، مخدوم، غلام ربانی تاباں اور راہی معصوم رضا کی قسم کے شاعروں کا ہو سکتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ آج تک ترقی پسند شاعری کی مدافعت کے سلسلے میں فیض کی شاعری کو سپر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور سردار جعفری نہیں چاہتے کہ انھیں فیض کی صف سے الگ کہیں جگہ ملے لیکن ترقی پسند شاعری کے دور عروج میں (جب کہ ابھی فیض راولپنڈی کیس کے سلسلے میں جیل نہیں گئے تھے) سردار جعفری ہی کو سب سے زیادہ اس بات پر اصرار تھا کہ فیض کی غنائیت اور ان کا رمزیاتی اسلوب سکہ بند ترقی پسندی کے منافی ہے اور ان کی جگہ ان لوگوں میں ہے جن کے اندر تذبذب ہے اور جو واضح طور پر ترقی پسند قوتوں کی جانبداری کے بجائے ابہام اور غیر جانبداری کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں سردار جعفری کو فیض سے کہیں زیادہ ترقی پسندی کا عنصر جگر کی شاعری میں دکھائی دیتا تھا۔

سردار جعفری کو میں ان کی یہ تنقید اس لیے یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے وہ اپنا مضمون بھول گئے ہوں، ورنہ فیض کو اپنی صف سے الگ دیکھ کر انھیں اس قدر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات یہ ہیں۔

"آج حق و باطل کی آخری لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ ایک طرف عدل اور صداقت کی طاقت ہے اور دوسری طرف ظلم اور فریب کی طاقت صف آرا ہے۔ ان دونوں کے درمیان میدان جنگ کے سوا کوئی جگہ خالی نہیں ہے: یا اس صف میں آجاؤ یا اس صف میں چلے جاؤ" یہ سوال آج ہر ادیب اور شاعر کے سامنے ہے

آفتاب شمسی

غزل

خیالِ ترکِ تعلق سے شرمسار تو ہے
ہمارے غم کا اُسے بھی اب اعتبار تو ہے
اب اور چاہیے کیا تجھ کو گردشِ دوراں!
تصوّرِ غمِ جاناں بھی ناگوار تو ہے
اسیرِ پنجۂ شب ہی کہو ہمیں لیکن
ہمیں بھی صبحِ درخشاں کا انتظار تو ہے
تمہارے بس میں نہ ہو چارۂ غمِ الفت
ہمارے ہاتھ میں دامانِ تارتار تو ہے
عجب نہیں جو پگھل جائے پاؤں کی زنجیر
کہ دل کی راکھ میں پوشیدہ اک شرار تو ہے
یہ آس کم نہیں شمسی کہ عہدِ حاضر کو
کسی حسین زمانے کا انتظار تو ہے

اور کوئی اس سے مکر نہیں سکتا۔ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ کل بارہ تک فیصلہ کرنا ہے۔ اور یا تو منصب کی بائیں صف میں جا کر کھڑا ہونا ہے ورنہ دوسری صف میں پس جائے گا۔ اگر اس حالت میں بھی کوئی شاعر ایسے شعر کہتا ہے جن سے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس صف کے ساتھ ہے تو اس کی شاعری بیکار ہے اور اس کا انجام بڑا خطرناک۔ اور وہ وقت آ سکتا ہے جب ہٹلری جرمنی کی طرح فاشسٹ طاقتیں یہ اعلان کر دیں کہ جو کوئی فاشزم کا حامی نہیں ہے اسے دشمن سمجھا جائے گا اور دار پر چڑھا دیا جائے گا۔ ایسے وقت میں غیر جانبداری بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس طرح کی غیر جانبداری کی سب سے دلچسپ مثال فیض کی شاعری ہے۔ پاکستان کی سرزمین کے جلد پیدا ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنی شاعری کو ان الفاظ سے پاک رکھا ہے جو اس دور کی سب سے بڑی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں یعنی سرمایہ دار اور مزدور اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ۔

ہمارے بعض ترقی پسند شاعر بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ اپنے دل کا مطلب استعاروں میں چھپا کر بیان کریں گے تو تعمیم بھی پیدا ہو جائے گی اور شعر بھی حسین ہو جائے گا۔ یہ بالکل غلط ہے۔

جگر اس دور کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں لیکن جب وہ سماجی موضوعات اور عوامی جذبات کے اظہار پر آتے ہیں تو ان کے شعر میں کوئی ابہام نہیں پیدا ہونے پاتا ؎

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

. . . .

ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل
جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
قومیت حقیقت عریاں ہے آج کل

اس میں جگر نے ہندو، مسلمان، انسانیت، جمہوریت، قومیت اور آزادی کے لیے استعارے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ جمہوریت اور قومیت کی طرح کے الفاظ غزل کی روایات کے خلاف ہیں۔

اس کے برعکس فیض نے اپنی ۱۵ اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اور آخری مصرعہ ہے ؎

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیکن یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھوں نے پاکستان کے لیے چھ صوبوں کا مطالبہ کیا تھا لیکن انھیں ملے مغربی پاکستان میں صرف ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔ پھر کیوں نہ ترقی پسند عوام کے بجائے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اسے اپنا قومی ترانہ بنا لیں اور ڈاکٹر صاحب کر اور گوڈسے بھی یہی کہتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھیں اکھنڈ ہندوستان نہیں ملا جسے وہ مہابھارت ورش اور آریہ ورت جاننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پوری نظم میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی سحر ہے اور منزل سے مراد عوامی انقلاب کی منزل۔ اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، بیابان نور کا دامن ہے، فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، نگارِ صبا ہے، چراغ سرِ رہ ہے، پکارتی ہوئی بانہیں ہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا درد اور اس درد کا مداوا۔ ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔

یہ شاعری کے سماجی مقصد سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے کہ فیض ایسا باکمال شاعر ابہام کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ مبہم استعاروں سے نظم کو آراستہ کرنے کی کوشش نے ایک اور گل کھلایا اور اس نظم کے دو مصرعے بے معنی ہو کر رہ گئے۔ وہ صرف خوبصورت الفاظ کا مجموعہ ہیں ؎

کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

. . . .

فیض کے برعکس ساحر لدھیانوی کی ۱۵ اگست کی نظم بالکل صاف ہے اور اس میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہیں ہے۔ اس نے بھی استعاروں ہی میں بات کہی ہے لیکن اس نے استعاروں کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ ابہام نہ پیدا ہونے پائے اور پوری قوت اور شدت سے عوامی جذبات کی ترجمانی ہو جائے۔

. . . .

کیفی نے اور بھی زیادہ صاف اور واضح انداز بیان اختیار کیا ہے اور اس میں خطابت کی شان آ گئی ہے۔

. . . .

اسے نعرے بازی کہہ کر جو شخص چاہے وہ اپنی انقلاب سے بے رنگی کو چھپا سکتا ہے۔ *

(ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل۔ سردار جعفری۔ شاہراہ۔ دہلی شمارہ (۲) ۱۹۴۹ء)

سردار جعفری نے یہ سب باتیں اگر کسی تقریر میں یا زبانی گفتگو کے دوران کہی ہوتیں تو ممکن ہے وہ آج یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتے کہ:

"جدید شاعری یا ترقی پسند شاعری یا ادب کے کسی مسئلے سے متعلق کوئی بیان میرا بیان اس وقت تک نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ خود میری تحریر میں نہ ہو۔"

مگر فیض کے خلاف یہ فریضۂ جہاد انھوں نے نہایت سنجیدگی

اور ذمہ داری کے ساتھ تحریری طور پر انجام دیا تھا اور نہ صرف یہ کہ فیض کو صراط مستقیم پر چلنے والے ٹھیٹ ترقی پسندوں یا جینی نسٹو اور پارٹی لائن کے مطابق نظمیں لکھنے والوں کی صف سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ فیض کی شاعری کے مقابلے میں "سوئے برلن جاری ہے سرخ ورنج سرخ پرچم ہے جلوہ فگن" "جو مٹی پر دانگا کا سرخ پانی چڑھ گیا" جیسی نظموں کو صحیح قسم کی ترقی پسند شاعری کا نمونہ قرار دیا تھا اور ان نظموں کے اقتباسات پیش کیے تھے۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ ترقی پسند شاعروں کا سلسلۂ نسب مایکافسکی سے ملتا ہے جبکہ فیض اس نوعیت کی شاعری کو نعرہ زنی سے تعبیر کرتے ہیں جعفری کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"درمیانی طبقے کے فرسودہ خیال نقاد شور مچاتے رہے کہ وہ ڈھنڈورچی ہے۔ سرمایہ داروں کے نمک خوار چلاتے رہے کہ وہ نعرے بازی کرتا ہے لیکن مایکافسکی کی شاعری انقلاب کی طرح چھا گئی اور آج وہ سوویت یونین ہی کا نہیں بلکہ ساری انقلابی دنیا کا سب سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر ہے، کیونکہ اس نے انسانیت کی ترجمانی کی ہے جو بیسویں صدی کی خالق ہے۔"

ہمارے بعض ترقی پسند شاعر بھی ان نظریات کا شکار ہیں جب فیض نے مجاز کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ نعرے نہیں لگاتا تو مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی تھی لیکن فیض کی نظم "مرے ہمدم مرے دوست" پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ فیض شاعری کو ہماری سماجی جدوجہد کا حربہ نہیں سمجھتے۔ یہ رویہ فیض کی "موضوع سخن" میں بھی ہے جس میں انھوں نے بھوک اگانے والے کھیتوں اور شہروں کی اداس فراواں مخلوق کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے ؎

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں

اس کے برعکس مایکافسکی ایک سچے انقلابی کی طرح اپنی شاعری کو جدوجہد کرتی ہوئی انسانیت کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار سمجھتا ہے...... شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا بھی شاعری کے بارے میں یہی رویہ ہے ؎

ملک کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھوں میں تلوار دیے دیتا ہوں

مجاز بھی یہی کہتا ہے......

تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام کرے

اور ساحر لدھیانوی بھی یہی کہتا ہے۔

آج سے اے مزدور کسانو میرے راگ تمہارے ہیں"

(ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل سردار جعفری)

سردار جعفری نے اپنے مضمون میں واضح طور پر اپنے قبیلے کا تعین کیا ہے اور مایکافسکی سے رشتہ جوڑتے ہوئے اردو میں ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی کی نعرہ زنی شاعری کو کھری ترقی پسند شاعری قرار دیا ہے اور فیض کو اس سے الگ رکھنے اور الگ ثابت کرنے کے لیے اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ پروگرام جینی نسٹو اور فارمولے کی شاعری اور نعرہ زنی کو جب براہ راست خط مستقیم کی شاعری قرار دیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ خط مستقیم کی شاعری اچھی ہے یا بری فیض کا نام سب سے پہلے آ ہی نہیں سکتا مگر سردار جعفری کی تمنا ہے کہ صرف فیض ہی کو ہدف بنایا جائے تاکہ اس کے جواب میں فیض کی ہی اور اچھی شاعری تمنا میں پیش کرنے کا حق کا منصوبہ کیا جائے۔ اب وہ فیض کو اپنی صف میں تلاش کرتے ہیں حالانکہ براہ راست کول سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ اس میں کوئی شخص، وامق جونپوری، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، نیاز حیدر اور راہی معصوم رضا وغیرہ کے نام لکھتے تھے کہ یہ میرے قبیلے کے شاعر ہیں۔ سردار جعفری کو ترقی پسندی کے زمانۂ شباب میں فیض کو خارج باہر کرنے کے لیے طول طویل مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور ان کو اپنی صف سے خارج کرنے کے لیے ان کے شاعرانہ عیوب کے لیے دلائل فراہم کرنے پڑتے تھے لیکن آج وہ ایسے اصلی نقلی گواہ فراہم کرنے میں مشغول ہیں جن کی گواہی پر فیض کو ٹھیٹ ترقی پسندی کی علامت قرار دیا جا سکے اور سرفہرست خود فیض کا نام آئے۔ اس ذہنی رویے پر ہنسی بھی آتی ہے اور عبرت بھی ہوتی ہے۔

مراسلہ

دو ہزار اردو ٹیچروں کی ضرورت کا اعلان کب ہوا؟

۶ فروری کے قومی آواز نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ دو ہزار اداروں میں دو ہزار اردو ٹیچروں کی ضرورت تھی مگر تقرری صرف ۱۹۰ کی ہوئی۔ وجہ یہ ظاہر کی گئی کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس نے رپورٹ نہیں بھیجی۔ بعض اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ حکومت نے ریاست کی ۱۵ اردو انجمنوں کے نام بھی ایک گشتی بھیجی تھی کہ وہ بتائیں کہ کن سکولوں میں اردو ٹیچروں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک انجمن نے بھی اس کی رپورٹ نہیں دی۔

افسوس تو یہ ہے کہ اس سے پہلے ایسی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی کہ دو ہزار اردو استادوں کی ضرورت ہے اور انسپکٹر صاحبان اور ۱۵ اردو انجمنوں سے رپورٹ مانگی گئی ہے۔ نہ ان انجمنوں کا نام ظاہر ہوا۔ نہ وہ گشتی اخباروں میں چھپی جس کے ذریعہ سے اردو استادوں کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی۔ کم سے کم بنارس کی انجمن ترقی اردو اور انسپکٹر صاحب سے تو پوچھا نہیں گیا۔

مناسب تو یہ تھا جیسا قاعدہ بھی ہے کہ اس ضرورت کو اخباروں میں مشتہر کیا جاتا اور امیدواروں سے درخواست مانگی جاتی اور ان میں سے دو ہزار اردو استادوں کا انتخاب ہوتا۔

اس اعلیٰ طاقتی اردو کمیٹی جس کے صدر آنریبل وزیر تعلیم ہیں۔ اس کی میٹنگ ۲۶ نومبر ۶۷ء کو ہوئی پھر جنوری میں میٹنگ ہونے والی تھی۔ غالباً جنوری میں میٹنگ نہیں ہوئی کیونکہ وزارتی بحران تھا۔ ۶ فروری کو یکایک یہ خبر اخباروں میں دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پہلے کوئی امیدوار وکیل یا ٹیچر بلا استاد نہیں رکھا جاتا تھا۔ نہ ٹریننگ میں بھیجا جاتا تھا۔ جب تک اردو ہندی دونوں زبانیں پاس نہ ہو۔ اور اردو داں کا کوٹہ مقرر تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اردو کی اہمیت کم کر دی گئی اور اب اردو جاننا انتخاب استاد و ٹریننگ کے لیے ضروری نہیں ہے جب یہی رہا ہے یہ حالت ہے تو اردو استاد کہاں سے آئیں گے۔ بنارس انجمن ترقی اردو کا وفد جب جناب وزیر تعلیم سے ۱۰ ستمبر ۶۷ء کو بنارس میں ملا تھا تو کئی کے وجوہات کو ظاہر کر دیا تھا۔ اور اپنی یادداشت کی ۲۹ میں صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ اردو استادوں کی کمی کو جامعہ اردو علی گڑھ کے پاس ادیب کامل وادیب ماہر سے پوری کی جائے جس کے لیے وہ کوا لیفائڈ ہیں۔ چونکہ صاحب موصوف کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے کچھ اور باتیں رہ گئیں اس لیے وزیر تعلیم نے ایک ماہ کے اندر اردو وفد بنارس کو لکھنؤ بلانے کا وعدہ فرمایا تھا اور بنارس سے دو درخواستیں بھی بھیجی گئیں کہ بنارس کے وفد کو جلد بلایا جائے اور اردو کمیٹی کا ایک آدمی اس کمیٹی میں رکھا جائے۔ مگر اس کا موقعہ نہ آیا۔ ہر اسکول میں اردو ٹیچر کی ضرورت ہے جس میں ایسے لوگ لئے جا سکتے ہیں مناسب ہے کہ اردو استادوں کے لیے مشتہر کی جائے اور ۱۹۴۷ء کے پہلے کی طرح انہیں امیدواروں کی تقرری وکیل یا ٹیچرز میں کی جائے۔ جو اردو ہندی دونوں زبان پاس ہوں تب ہی مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں اور کوٹہ مقرر کیا جائے۔ اس کے لیے الگ سے بنارس سے خط و کتابت عرصے سے چل رہی ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ جولائی ۱۹۵۸ء میں مرکزی و اسٹیٹ گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ اردو ٹیچروں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے نو برس ہو گئے اس پر عمل درآمد نہ ہوا۔ بلکہ خلاف اس کے یو۔ پی گورنمنٹ کا جواب بذریعہ کمشنر لسانی اقلیت آیا کہ جی او مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۳ء کی رو سے ٹریننگ کا انتخاب ہوتا ہے اس میں اردو ٹریننگ کا پروویژن نہیں ہے۔ اردو ٹیچر کے لیے انتظام نہیں ہو سکتا اور نہ اردو کو ترجیح دی جا سکتی ہے ۱۹۴۷ء کے پہلے کے قاعدہ کے متعلق جو لکھا گیا تھا۔ اولاً جواب دیا کہ ایسا قاعدہ نہیں ہوتا۔ جب یہاں سے قاعدہ کا حوالہ دیا گیا۔ تب جواب دیا کہ ایسا قاعدہ تھا ۱۸ مئی ۱۹۶۶ء سے اس جی او کی نقل مانگی جا رہی ہے۔ دو مرتبہ کمشنر لسانی اقلیت نے لکھا کہ جی او کی نقل نہیں ملی۔ جب ہدایت ان کے جب یہاں سے درخواست ۲۹ اپریل ۶۷ء کو لسانی اقلیتی افسر یو۔ پی سکریٹریٹ لکھنؤ کو لکھی گئی۔ یاد دہانی کی گئی۔ تب جواب دیا کہ جی او کا حوالہ غلط دیا گیا ہے۔ اس سے یہ جی او نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے جی او کے متعلق SUBJECT MATTER مانگا جو بھیج دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء کے اعلان کے خلاف ۱۹۶۳ء میں ایسا جی او کیسے جاری ہوا۔ سب سے بڑی تعجب کی بات یہی ہے۔

لہٰذا جب تک اردو ٹیچروں کے انتخاب کا کوٹہ نہیں مقرر ہوتا ٹریننگ نہیں ہوتی ۱۹۴۷ء کے پہلے کا قاعدہ نہیں برتا جاتا۔ تب تک اردو ٹیچروں کی کمیابی ظاہر ہے۔ امید ہے کہ اعلیٰ طاقتی اردو کمیٹی اس پر جلد از جلد غور کرے گی۔

مزید بر آں ۲۱ فروری ۱۹۶۸ء کے قومی آواز سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ یو۔ پی نے تعلیم سے متعلق ریاستی مشاورتی بورڈ قائم کیا ہے جس میں یو۔ پی کے مختلف اضلاع کے ۹ ممبران ہیں۔ علاوہ سرکاری افسران کے اگر صرف کانگریس کے وقت کے تمام جی او و سرکلر پر عمل درآمد کرا دیا جائے تب بھی اردو والوں کی ۹۰ فی صدی مصیبت کم ہو جائے ڈائرکٹر ڈپٹی ڈائرکٹر انسپکٹر و ڈپٹی انسپکٹر کے ہوتے ہوئے اس کمیٹی کے تقرر سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ وقت گزر رہا شکایت رفع نہ ہوگی۔ نہ کرپلانی کمیٹی نے کوئی شکایت دور کی۔ نہ اس کمیٹی سے کچھ ہوگا اور نہ ضرورت ہے کیونکہ جی او سرکلر ہدایات پہلے سے موجود ہیں۔ صرف نفاذ کرنا ہے۔

(دواتا رسول سکریٹری شعبہ تعلیم انجمن ترقی اردو بنارس)

یوپی میں اردو کے خلاف مہم کی نئی شکل

لکھنؤ ۱۶ مارچ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے لسانی الجھن کو طے کرنے کے لیے تین زبانوں کا فارمولا تجویز کر رکھا ہے۔ مگر یوپی میں اس پر عمل کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں اس فارمولے کے تحت مادری زبان یا کوئی علاقائی زبان ہندی اور انگریزی کے ساتھ پڑھائی جائے گی۔ فارمولے میں ہندی علاقوں کے رہنے والے طلبہ کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ جنوبی ہند کی کوئی زبان سیکھیں یوپی کے ہائی اسکولوں کی کلاسوں میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ اگر ایک سو طلبہ کے لیے ایک ٹیچر بھی ہو تو جنوبی ہند کی زبانیں پڑھانے کے لیے ۲۰ ہزار ٹیچروں کی ضرورت ہوگی۔ لکھنؤ کالج کے پرنسپل نے جو مشہور ماہر تعلیم ہیں نمائندہ ٹائمس سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ایسے بیس ہزار اساتذہ کا ملنا ناممکن ہے جو ہندی زبان میں جنوبی ہند کی کوئی زبان پڑھا سکیں۔ ایک ناقابل حل دشواری یہ ہے کہ یوپی میں ایک سکنڈری اسکول کے ٹیچر کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ روپے ہے۔ جنوبی ہند سے صرف چند اساتذہ اس تنخواہ پر یوپی آنا منظور کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کے لیے یہاں کی آب و ہوا بھی موافق نہیں اس کے برعکس جناب راجگوپال آچاریہ نے دو زبانوں (علاقائی زبان اور انگریزی) کا جو فارمولا پیش کیا ہے اور جس پر مدراس کی حکومت مؤثر طریقے سے عمل کر رہی ہے۔ والدین اور ماہرین تعلیم میں زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اکثر کانگریسی تین زبانوں پر ہندی اور انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ تین زبانوں کا پڑھنا طلبہ کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ وہ کہتے ہیں انگریزی پہلے سے موجود ہے اور طلبہ بغیر کسی دشواری کے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ جنوبی ہند کی کوئی زبان پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس ادا کرنے والوں کی رقوم کو ایک ایسے کام پر خرچ کیا جائے جس میں کامیابی یقینی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی جن سنگھ اور ایس ایس پی انگریزی کی ثانوی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ سارا ملک ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کرے۔ ایک کانگریسی لیڈر نے کہا ہے یہ بات کچھ مشتبہ سی ہے کہ مرکزی حکومت یوپی کو تین زبانوں کے فارمولے پر عمل کرنے کے لیے مجبور کر سکے گی تعلیم ایک صوبائی مسئلہ ہے اگر ڈی۔ ایم۔ کے کی حکومت کھل کر اس فارمولے کے سلسلہ میں مرکزی حکام کی خلاف ورزی کر سکتی ہے تو یوپی میں بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ لسانی فارمولا میں جنوبی ہند کی ہی کسی زبان کا پڑھنا لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ یہ زبان آئین میں درج کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ اور ان میں بنگلہ، اردو اور پنجابی بھی شامل ہیں۔ جنوبی ہند کی زبان کی پابندی اردو کشی کا ہی ایک سلسلہ ہے۔

(الجمعیۃ)

بزم ادب صاحب گنج کالج میں پروفیسر احتشام حسین کی تقریر

صاحب گنج بزم ادب صاحب گنج کالج کا چھٹا سالانہ جلسۂ مشاعرہ ۹ مارچ ۱۹۶۸ کو اردو زبان کے مشہور نقاد و ادیب جناب پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بزم کے سکریٹری نے ایک مختصر رپورٹ [illegible] جس میں تمام شعرا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ ناظم مشاعرہ کا کام جناب پروفیسر اختر بلگرامی صدر بزم انجام دے رہے تھے۔ پرنسپل شیو بالک رائے نے جناب احتشام حسین کی ہمہ گیر شخصیت کا تعارف کرایا۔ صدر جلسہ جناب احتشام حسین نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ آج ہندوستان جو ایک وسیع اور عظیم ملک ہے مختلف جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے۔ لسانی جھگڑے مرکزی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان لسانی جھگڑوں کی وجہ سے یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہندوستان کہیں ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جائے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زبان کی پیدائش کے متعلق تمام لوگ غلط فہمیوں کے شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کی تمام زبانیں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ زبانیں تو لوگوں کی تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور تمدنی ضروریات کی تکمیل کے لیے جنم لیتی ہیں اور ضروریات کی تکمیل کے لیے ایجاد و گھڑی جاتی ہیں۔ اردو زبان تو دریائے گنگا کے اس رواں دواں دھارے کی طرح ہے جو تمام ہندوستان میں اپنے مختلف روپ و شکل میں بہتی رہتی ہے۔ اس زبان کے دھارے کو نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ موڑا ہی جا سکتا ہے۔ [illegible] زبانوں کا تو کوئی دھرم ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مذہب ہندوستان میں اب انگریزی کی ضرورت نہیں ہے ضرور ختم ہو جانا چاہئے لیکن اس سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے زبانیں ترقی [illegible] بنتے بنتے کئی صدیوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ زبانیں آہستہ آہستہ بدلتی ہیں [illegible] اس کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ مغربی ممالک کے باشندوں کا ذہن [illegible] بالکل صاف ہے۔ وہ تمام زبانوں کو سیکھنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ صدر موصوف کی تقریر کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مشاعرے میں جناب شمس نائل پورنوی، جوہر [illegible] عظیم آبادی، کمال الدین کمال صدیقی، ابرار الحق میراتی، محبت مونگیری، اشرف دیوانی، ایوب صابر، شاہد گیاوی، امر ناتھ آمر، اکرام [illegible]، ثمر الدین ثمر، وفا ملک پوری، تصدیق اشہر، [illegible] شاعر، مرتضیٰ عظیم آبادی، لطف الرحمن اور جناب احتشام حسین نے حصہ لیا۔ ۲ بجے رات میں جلسۂ مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

(کمال الدین [illegible] سکریٹری بزم ادب)

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت میں اطہر پرویز کا میمورنڈم

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے استاد جناب اطہر پرویز نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کی خدمت میں اپنی تین تصانیف جن میں بیشتر پر گورنمنٹ سے انعامات مل چکے ہیں پیش کرتے ہوئے ذیل کا میمورنڈم پیش کیا۔

پچھلے بیس سال سے مصنف بچوں اور بالغوں کے لیے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کر رہا ہے اور بڑے دکھ اور درد سے وزیر اعظم کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر رہا ہے کہ اتر پردیش، بہار، اور دلی وغیرہ ریاستوں

جہاں اردو کی ابتدا اور نشو و نما ہوئی وہیں اردو زبان کے لیے ایک المناک صورت حال درپیش ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ریاستوں کے زیادہ تر اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور اردو زبان اور رسم خط خود ہمارے لیے اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ آج اردو میں ایک اشاعتی ادارہ بھی ایسا نہیں ہے جو بچوں کے لیے کتابیں چھاپ سکے کیونکہ بچوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ مصنف کے پاس اس وقت بھی تقریباً دو درجن مسودے ایسے ہیں جو اس سبب سے نہیں چھپ سکے۔ یہ بات کہ اردو جیسی گرانبہا اور مہذب زبان آہستہ آہستہ مرتی جا رہی ہے ان تمام لوگوں کے لیے باعث تشویش و فکر ہونا چاہیے جو تہذیب و روایت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بیس سال کے اندر اندر تعلیمی اداروں میں اردو کی اہمیت ختم ہوتی چلی جا رہی ہے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ آتا ہے۔ وہ کس کے لیے لکھیں؟ اردو میں بچوں کا کوئی پروگرام آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے نشر نہیں ہوتا اور اس کے نتیجے کے طور پر بچوں کے لیے لکھنے والے ادیبوں کو ریڈیو کے ذریعے ادب نشر کروانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ چلڈرن بک ٹرسٹ میں اردو ادیبوں کی کوئی نمائندگی نہیں کرتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس ٹرسٹ سے آج تک اردو کی کوئی کتاب نہیں چھپ سکی۔

انجمن ترقی اردو بنارس کی ادبی نشست

انجمن ترقی اردو بنارس کی جانب سے ۲۰ مارچ ۱۹۹۸ء کو مسلم ہائر سکنڈری اسکول میں مقالہ خوانی کا مقابلہ منعقد ہوا۔ مقالہ کا عنوان مرزا غالب متعلق اردو نثر نگاری یا شاعری تھا جس میں حسب ذیل طلبہ نے حصہ لیا۔

(۱) بدیع الزماں — دیانند انٹر کالج بنارس
(۲) عبد القدوس — جے۔ پی۔ مہتا انٹر کالج بنارس
(۳) مناظر حسین — مسلم ہائر سکنڈری اسکول بنارس
(۴) شمیم احمد انصاری — ہریش چندر انٹر کالج بنارس
(۵) صابر اعظمی — مظہر العلوم بنارس
(۶) احمد صغیر معانی — کاشی ودیاپیٹھ بنارس

اس نشست کی صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر احمد حسین صاحب لکچرر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے انجام دیے۔ اس مقابلہ میں شمیم احمد انصاری کو اول، بدیع الزماں کو دوسرا اور مناظر حسین کو تیسرا انعام ملا۔ جناب ڈسٹرکٹ سیشن جج بنارس نے ان تینوں طلبہ کو انعام تقسیم کیا۔ بقیہ تین طلبہ کو حسب خواہش جناب پرنسپل صاحب اسپیشل انعام دیا گیا۔ اسپیشل انعامات جناب نہال الدین احمد صاحب پرنسپل مسلم ہائر سکنڈری اسکول نے دیا۔

مقالہ کے مقابلہ کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب احمد مرزا صاحب ڈسٹرکٹ سیشن جج بنارس نے فرمائی۔ مشاعرہ میں کافی شعرا نے حصہ لیا۔ سامعین کی تعداد بہت کافی تھی۔ نظامت کے فرائض جناب سلیمان آصف صاحب نے انجام دیے۔ مشاعرہ میں مقامی و بیرونی شعرا نے حصہ لیا۔ جناب بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاکٹر آل رسول جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس)

بزم شعرائے رامپور کے زیر اہتمام مشاعرہ

رامپور ۲۰ مارچ۔ یہاں ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب میں جناب محب علی خاں قادری ڈائرکٹر اخبار ناظم کے مکان پر بزم شعرائے رامپور کے زیر اہتمام غالب کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب رگھوبیر سہائے ایڈوکیٹ نے اور سکریٹری کے فرائض جناب شبیر علی خاں شکیب رامپوری نے انجام دیے۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے چند قابل ذکر شعرا کے نام حسب ذیل ہیں۔

جناب پروفیسر [illegible] صدیقی، جناب پروفیسر نجم الدین نقوی رئیس رامپوری، خیال رامپوری، جمیل نعمانی، ہوش نعمانی، دور آفریدی، ظہیر جمیل نعمانی، ذوقی رامپوری، ہلال رضوی، قیس رامپوری، کلیم طوری، شکیب رامپوری، وداگرامی، جگر مرزاپوری، عروج زیدی بدایونی، دلدار روحانی اور مضطر وغیرہ۔ (ناظم علی خاں)

انجمن ترقی اردو جبلپور کا انتخابی جلسہ

جبلپور ۲ مارچ ۱۹۹۸ء کو ممبران انجمن ترقی اردو جبلپور کا ایک عام جلسہ برائے انتخاب عہدیداران دفتر انجمن واقع لارڈ گنج میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے سکریٹری انجمن نے انجمن کی کارگزاری و آمد و خرچ کا حساب پیش کیا۔ اس کے بعد انجمن کے مستقل سرپرست خصوصی جناب پنا لال صاحب شریواستو ایڈوکیٹ نے انجمن کے کام میں تعاون کرنے کے لیے لوگوں کو توجہ دلائی۔ بعد ازاں شریواستو صاحب ہی کی نگرانی میں انجمن کے نئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر: ڈاکٹر پریم چند شریواستو وائس پرنسپل کامرس کالج
نائب صدر: نذیر احمد انصاری۔ سکریٹری و خزانچی: حافظ محمد جمیل الرحمن خاں غوری۔ جوائنٹ سکریٹری: دامودر پرساد چترویدی پرکاش۔ مجلس عاملہ کے لیے ذیل کے ممبران منتخب ہوئے۔ محمد حنیف انصاری لکچرر، دیانند کھرے ایڈوکیٹ، سیٹھ عباس بھائی، محمد خضر حیات، احمد علی خاں احمر مراد آبادی، بدری پرساد تیواری۔ تمام عہدیداران کا انتخاب بالاتفاق بغیر کسی مقابلہ کے بحسن و خوبی انجام پذیر ہوا۔ اس کے بعد مشاعرہ کا دور شروع ہوا جو تقریباً دو بجے رات تک چلا۔

(دامودر پرساد چترویدی۔ جوائنٹ سکریٹری)

انجمن ترقی اردو پورنیہ کا جلسہ

پورنیہ۔ پورنیہ ضلع انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی ایک نشست ۲۴ مارچ کو جناب وکیل الرحمن خاں ایڈوکیٹ کے زیر صدارت اور انھیں کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی۔ ضلع کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اراکین مجلس عاملہ نے اس طویل نشست میں موجودہ صورت حال کے تحت اردو تحریک کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان منوانے کا جو مطالبہ اور تحریک ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے۔ مگر اس زبان کی ترقی، ترویج، اشاعت اور مقبول عام بنانے کی دشوار تر ذمہ داری انجمن ترقی اردو اور اردو داں طبقہ پر ہی ہے حکومت اس عوامی مطالبے اور کیے گئے وعدوں سے روگردانی اور فراری کر سکتی ہے۔ مگر انجمن ہر حال میں اردو کی بقا و تحفظ کے لیے سرگرم عمل رہے گی ہماری سرگرمیوں کا پہلا محاذ عوام میں اردو کے لیے جذباتی وابستگی پیدا کرنا اور اس زبان کو بچانے کے لیے لاکھوں اردو کے جاں نثاروں میں تن من دھن کی بازی لگا دینے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ مجلس عاملہ کی نشست نے ضلع کاؤنسل کی تجویز کے مطابق ضلع مجلس عاملہ کے لیے کشن گنج سب ڈویژن سے جناب شمس جمالی ایڈوکیٹ، جناب ڈاکٹر عبد السلام صاحب، جناب حاجی اشرف علی صاحب اور جناب تسنیم ربانی اور کٹیہار بلا بارسی سے جناب حبیب الرحمن نامزد کیے۔ جناب قمر الہدیٰ صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ضلع انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ دوسری تجویز کے ذریعہ یہ طے کیا گیا کہ پورنیہ ضلع میں کثیر اردو داں آبادی ہونے کے باوجود اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے میں محکمہ تعلیم کی سرگرمی تشفی بخش نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے چلنے والے بہت سے اسکولوں سے ایسی شکایتیں ملی ہیں کہ اردو طلبہ کی مانگ کرنے پر بھی اردو ٹیچر بحال نہیں کیے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو داخلہ دینے سے بھی انکار کیا جا رہا ہے یہ نشست اس ضلع کے تمام ورناکولر، اپر پرائمری، مڈل اسکول اور ہائی اسکول میں پڑھنے والے اردو داں طلبہ اور اساتذہ کی مردم شماری کرنے اور اردو تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں دشواریوں کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل کرتی ہے جن کے ذریعہ پورنیہ صدر کٹیہار پر مشتمل ایک سب ڈویژن میں سب ڈویژن سب کمیٹی کی تشکیل کرانا ان کے ذریعہ اردو داں طلبہ اور اساتذہ کے اعداد و شمار فراہم کرانا اردو تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں دشواریوں کا جائزہ لینا اور محکمہ تعلیم کے افسران سے مل کر اردو تعلیم کی مناسب سہولتیں فراہم کرانا ہوگا اس کمیٹی کے لیے درج ذیل اراکین منتخب ہوئے۔

(۱) جناب کفیل الرحمن خاں ایڈوکیٹ پورنیہ (۲) جناب حفیظ الدین صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۳) جناب ابو الحسن صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۴) جناب محمد زین الحق صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۵) جناب تسنیم ربانی صاحب کشن گنج (۶) جناب محمد یٰسین صاحب ایڈوکیٹ (۷) جناب مختار احمد صاحب ایم اے کٹیہار

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی کی تقریر

علی گڑھ ۱۲ مارچ۔ انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا جلسہ زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں مانز یونیورسٹی مغربی جرمنی کے ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی نے لسانیاتی نظریۂ شعر کے عنوان سے ایک لکچر دیا۔ موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز افلاطون کے نظریۂ شعر کی تنقید سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ شاعری حقیقت کی مختلف احساسات کی عکاسی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری میں جو احساسات اور تجربات پیش کیے جاتے ہیں ان میں اور بچوں کی زبان میں بڑی مماثلت ہے مثلاً بچے اپنے تاثرات اور جذبات کو پیش کرتے وقت زبان کے مروجہ قواعد کی پابندی نہیں کرتے اور من مانے انداز میں زبان کو استعمال کرتے ہیں اور قواعد کی رو سے بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں یہی بات شعراء کی زبان کے سلسلہ میں کہی جاسکتی ہے شاعر حقیقت کو سائنسی اور معروضی انداز میں دیکھنے کے بجائے تاثراتی اور جذباتی انداز کو اختیار کرتا ہے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاعر حقیقت کو پیش نہیں کرتا ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ حقیقت کو اس طرح پیش نہیں کرتا جس طرح کہ ایک سائنس داں پیش کرتا ہے مثلاً جب ایک بچہ یہ کہتا ہے کہ چڑیا بھاگے جا رہے تھے تو اس نے حقیقت کا اظہار کیا لیکن اس میں تاثراتی انداز غالب ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی نے بچوں کے انداز اور شعراء کے طریقۂ فکر و احساس کی مماثلتوں کو بعض دوسری مثالوں سے ثابت کرتے ہوئے اردو کے قدیم شاعروں اور بعض جدید شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دیں۔ انھوں نے غالب کے دو سو اشعار اور جدید شعراء کے دو سو اشعار کے تجزیے سے یہ ثابت کیا کہ ان اشعار میں علم اساسے۔ خواہشات اور جامد کی ذکر (MAGICAL WORD) کا ایک خاص تناسب ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی زبان کی ایک علیحدہ قواعد تیار کرنے پر بھی زور دیا کیونکہ شاعری کی زبان ایک طرح تاریکی زبان ہوتی ہے۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو انگی (رانچی) کا انتخابی جلسہ

انگی (رانچی) انجمن ترقی اردو انگی رانچی کا ایک عام جلسہ جناب حمید صاحب کے مکان پر ہوا۔ جس میں حلقہ کے تمام حضرات شریک تھے۔ مڈل ہائی اسکول اور کالج کے طلبہ پیش پیش رہے۔ جلسہ بصدارت جناب جمال الدین بی اے منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل حضرات مختلف عہدوں کے لیے منتخب ہوئے۔

۱۔ صدر: جمال الدین صاحب
۲۔ نائبین: سعید احمد صاحب، رحمت اللہ صاحب
۳۔ جنرل سکریٹری: اقبال احمد صاحب، نائبین: محمد شاہد حق صاحب،
۴۔ ایم اسلم صاحب۔
۴۔ خازن: محمد طیب صاحب۔ ممبران منتظمہ: شفیق احمد، اظہر امام، زبیر احمد، جمیل احمد، ارشد جمالی، انجم عالم، محمود الدین، ماسٹر یٰسین، شفیع، محمد منصور، محمد مشتاق، محمد ایوب، محمد نعیم الدین، محمد معین الدین، محمد لیاقت علی، محمد عثمان، محمد اسمٰعیل، محمد خورشید محمد صاحبان۔

ایک تاثراتی

٢٣ مارچ ٦٨ء۔ ایک ناقابل فراموش تقریب

٢٣ مارچ کو قریب چار بجے میں اور محمود ہاشمی راؤز ایونیو پہنچے۔ انجمن کی عمارت کا سنگ بنیاد جس جگہ رکھا جانے والا تھا وہاں تک پہنچنے میں ہمیں تقریباً دس منٹ لگے۔ جب ہم شامیانے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہمیں سرور صاحب نظر آئے جن کے گھونگریالے بال ہوا کی اٹکھیلیوں سے بے ترتیب ہو گئے تھے خوبصورت سیاہ سوٹ پر گرد و پیش کی گرد نے کچھ نقش و نگار بنا رکھے تھے۔ ان کے چہرے پر تھکن سی نظر آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں پورٹ فولیو اور دوسرے ہاتھ میں کچھ کاغذات کا ایک پلندہ تھا مجھے دیکھتے ہی کہا جلدی میں تو میں سمجھ رہا تھا کہ تم بہت پہلے آ جاؤ گے اور انتظامات میں میری مدد کرو گے۔ ایک صاحب نے جو خاصے وحشت زدہ معلوم ہو رہے تھے سرور صاحب کی تائید کے جوش میں کچھ کہہ دیا۔ میں سن نہ سکا لیکن سرور صاحب کے چہرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ ایک دم ختم ہو جانے سے مجھے اندازہ ہوا کہ انھیں ان حضرت کی بے تکلفی پسند نہیں آئی۔ سرور صاحب نے میرے سپرد کتابوں کے وہ بنڈل کیے جو انجمن کے صدر محترمہ اندرا گاندھی کو پیش کرنے والے تھے اور وہ ہار دیا جو انجمن کے سابق صدر جناب کرنل بشیر حسین زیدی محترمہ اندرا گاندھی کو پہنانے والے تھے اور محمود ہاشمی سے کہا کہ آپ عبد اللطیف اعظمی صاحب کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کیجیے اور انھیں مناسب نشستوں پر بٹھائیے ......

عبد اللطیف اعظمی صاحب حسب معمول چاق چوبند اور مستعد نظر آ رہے تھے ...... سرور صاحب پھر انجمن کے نائب معتمد محمد حفیظ الدین اور ناصر حسین، حبیب خاں کو کچھ ہدایتیں دینے لگے۔ مالک رام صاحب بار بار ڈائس کو دیکھ رہے تھے اور اس کی ترتیب سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے تھے پھر یک دم کچھ آدمیوں کی مدد سے انھوں نے اس تخت کو ڈائس کے سامنے سے ہٹا دیا جس پر سے ہو کر اندرا گاندھی صاحبہ ڈائس پر جانے والی تھیں اور ڈائس کے دائیں طرف سنگ بنیاد کے پیچھے لگا دیا۔ سیکورٹی کے آدمیوں نے ڈائس کے ادھر ادھر دیکھا اور ڈائس پر چڑھنے اترنے کی ریہرسل کی۔ ... ہمارے دائیں طرف ڈائس کے بائیں طرف انجمن کی مطبوعات سجے ہوئے اسٹینڈ اور خوبصورت شیلفوں کے پاس انجمن کی مجوزہ بلڈنگ کے ماڈل کو ترتیب دینے میں مصروف نظر آ رہے تھے اور اپنے نائبوں کو پکار پکار کے ہدایتیں دے رہے تھے۔ اب ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے یونس سلیم صاحب ڈپٹی منسٹر (قانون) آئے۔ ان کے بعد پنڈت سندر لعل، آنند نرائن ملا، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین، میر مشتاق احمد، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مختار الدین احمد، سکندر علی وجد، [illegible]، حیات اللہ انصاری، پروفیسر محمد مجیب اور بہت سے دوسرے مہمان یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ عبد اللطیف صاحب ان کو مناسب نشستوں پر بٹھانے کا فرض انجام دے رہے تھے۔ پانچ بج کر پینتیس منٹ پر سرور صاحب نے انجمن کے تمام ممبروں کو اکٹھا کیا اور محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ کی پیشوائی کے لیے جلوس کی شکل میں اس دروازے کی طرف بڑھے جس سے وزیر اعظم آنے والی تھیں۔ ڈائس پر چھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک محترمہ اندرا گاندھی کے لیے۔ ایک انجمن کے صدر کے لیے، دو انجمن کے نائب صدر کے لیے، ایک سابق صدر کے لیے اور ایک جنرل سکریٹری کے لیے۔ محترمہ اندرا گاندھی ٹھیک پانچ بج کر چالیس منٹ پر پہنچ گئیں اور انجمن کے اراکین کے جلوس میں پنڈال میں داخل ہوئیں۔ تمام مہمان احتراماً اپنی نشستوں سے اٹھ گئے اور تالیوں سے محترمہ اندرا گاندھی کا استقبال کیا اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک محترمہ اندرا گاندھی اپنی نشست پر بیٹھ نہ گئیں۔ باقی حضرات بھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ البتہ جناب کرنل اور پنڈت سندر لال صاحب اس کرسی پر بیٹھ گئے جو جنرل سکریٹری کے لیے مخصوص تھی۔ سرور صاحب نے تمام حضرات کو پروگرام کی کاپیاں دیں اور اعلان کیا کہ جامعہ ملیہ کے طلبا اور طالبات اقبال کے مشہور ترانے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے اس تقریب کا آغاز کریں گے۔ جامعہ کے طلبہ اور طالبات نے اپنی نرم آواز میں اقبال کا ترانہ گایا۔ ترانے کے بعد سرور صاحب نے اس تقریب کے سلسلے میں موصول ہونے والے پیامات میں سے صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور نائب وزیر اعظم کے پیامات سنائے۔ پیامات کے بعد صدر انجمن نے انجمن کی خاص مطبوعات کے دو سیٹ اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کیے اور زیدی صاحب نے ان کی گلپوشی کی۔ صدر انجمن نے لکھی ہوئی مختصر تقریر پڑھنا شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور رکن انجمن ترقی اردو ہند اپنی مخصوص آہستہ روی کے ساتھ پنڈال میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے غلام ربانی تاباں اور پھر فراق گورکھپوری اندر داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ صدر انجمن خاصی بلند آواز میں اپنی تقریر پڑھ رہے تھے لیکن پھر بھی [illegible] تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بے کیف ہو جاتی تھی۔ صدر کی تقریر ختم ہوئی تو حاضرین نے تالیوں سے تقریر کی داد دی۔ صدر انجمن نے محترمہ اندرا گاندھی سے درخواست کی کہ وہ انجمن کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھیں۔ محترمہ اندرا گاندھی، صدر انجمن، جنرل سکریٹری اور دوسرے حضرات ڈائس سے اترے اور اس جگہ پر آ کر ٹھہر گئے جہاں خوبصورت اور سیاہ سنگ مرمر زنجیروں میں لٹکا ہوا اندرا گاندھی صاحبہ کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کے لیے منتظر تھا۔ محترمہ اندرا گاندھی نے چاندی کی کرنی سے تھوڑا سا پلاسٹر اس خالی جگہ پر پھیلا دیا جہاں پتھر کو رکھنا تھا اور مزدوروں نے ان زنجیروں کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا جو پتھر کو تھامے ہوئے لٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی پتھر اپنی جگہ پر آیا پورا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ پتھر پر نستعلیق میں تمام عبارت بڑے خوبصورت طریقے سے کھدی ہوئی تھی۔ پتھر دور سے بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ سنگ بنیاد رکھنے کے بعد محترمہ اندرا گاندھی نے انجمن کی مجوزہ بلڈنگ کا ماڈل اور نقشے دیکھے اور انجمن کی مطبوعات کی نمائش کو دیکھا اور پھر واپس ڈائس پر آ گئیں۔ صدر انجمن نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ وہ اس تقریب پر کچھ کہیں۔ اندرا گاندھی تقریر کے لیے کھڑی ہوئیں۔ ان کے چہرے پر وہی معصومیت اور چمک تھی جو پنڈت نہرو کے چہرے کا حسن تھی۔ انھوں نے بڑے دھیمے لیکن پر وقار انداز میں کہنا شروع کیا کہ اردو بڑی شاندار اور جاندار زبان ہے۔ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ یہ پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس ایکتا کی نشانی ہے جس کے لیے گاندھی جی اور پنڈت جی تمام عمر جد و جہد کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اردو گھر کی تعمیر سے وطن کی ایکتا مضبوط ہوگی۔ وزیر اعظم اپنی مخصوص زبان میں تقریباً بیس منٹ بولتی رہیں اور سننے والے ان کی ایک ایک بات کو توجہ اور انہماک سے سنتے رہے۔ وزیر اعظم کی تقریر کے بعد سرور صاحب نے اردو کے متعلق اپنی ایک چھوٹی سی نظم پر اثر انداز میں پڑھی جو اس موقع کے لیے لکھی گئی تھی۔ اور اس نظم کے بعد ملا صاحب نے تقریر کی جس میں انھوں نے شدت کے ساتھ اردو کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں پر احتجاج کیا اور بتایا کہ اردو صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی اہم ترین زبانوں میں ہے۔ اس کا ادب دنیا کے ادب سے آنکھیں ملا سکتا ہے۔ یہ کسی ایک علاقے کی نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔ ملا صاحب کی تقریر کے ایک ایک فقرے پر تالیاں بج رہی تھیں اور لوگ ان کی حق گوئی اور بیباکی کی داد دے رہے تھے۔ ملا صاحب کے بعد زیدی صاحب شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے اور نہایت ہی مہذب اور پاکیزہ انداز میں غالب کے ایک شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ نہرو خاندان کی اردو دوستی کا ذکر کیا اور پنڈت جی کے [illegible] اس میں سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا جس میں اردو کے سیکولر مزاج پر زور دیا گیا تھا۔ اردو کی اہمیت کا تذکرہ انھوں نے اپنے مخصوص نرم و شیریں لہجے اور دل نشیں انداز میں کیا اور امید ظاہر کی کہ اردو کو اس کا صحیح مقام ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔ زیدی صاحب کی تقریر کے بعد جامعہ کے طلبا اور طالبات نے قومی ترانہ جن گن من گایا اور اس طرح یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔ تقریب ختم ہوتے ہی سرور صاحب کو ان کے دوستوں نے گھیر لیا اور اس تقریب کی کامیابی پر انھیں مبارکباد دینے لگے۔ ہر شخص خوش نظر آتا تھا۔ انجمن کے کارکنوں کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔